سلسلۂ اشاعتِ تنظیمِ اسلامی نمبر ۸

اسلامی نظمِ جماعت میں
بیعت کی اہمیّت

ڈاکٹر اسرار احمد
بانیٔ تنظیمِ اسلامی

اردو ترجمہ:
ڈاکٹر احمد افضال

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون:3-35869501
www.tanzeem.org

اسلامی نظمِ جماعت میں بیعت کی اہمیت

بانیٔ تنظیم اسلامی نے یہ فکر انگیز خطاب اگست ۱۹۹۵ء میں
شکاگو (امریکہ) میں بزبانِ انگریزی فرمایا

خطبۂ مسنونہ، متعلقہ آیاتِ قرآنیہ واحادیثِ نبویہ اور ادعیہ ماثورہ کے بعد:

محترم خواتین وحضرات! آپ کے علم میں ہے کہ آج مجھے ’’اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت اور اس کی اساس‘‘ کے موضوع پر خطاب کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بنیادی طور پر قرآن حکیم کا طالب علم ہوں، اور چونکہ میں اپنے فہم کے مطابق اللہ کی کتاب کے علم اور اس کی حکمت کو عام کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں، لہٰذا آپ مجھے قرآن کا معلم بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم آج کا خطاب اصلاً چند احادیثِ نبوی ﷺ کے حوالے سے ہوگا، اور صرف ثانوی درجے میں قرآنی آیات کا حوالہ آئے گا۔ یہ بات ان شاء اللہ ایک سادہ سی مثال سے واضح ہو جائے گی کہ میں احادیث کو کیوں بنیاد بنا رہا ہوں۔

سنتِ رسولؐ سے راہنمائی

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن حکیم میں نماز کو قائم کرنے پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ اس عبادت کی اہمیت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ نماز کے تمام عناصرِ ترکیبی کا ذکر متفرق طور پر قرآن حکیم میں آیا ہے...... جیسے قیام، رکوع، وضو اور تیمم...... لیکن نماز کی کوئی واضح شکل اور اس کا مکمل طریقہ قرآن میں کہیں نہیں ملتا۔ اقامتِ صلوٰۃ کی اہمیت تسلیم، لیکن اس کی عملی صورت کیا ہو؟ اس عملی صورت کو معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہم سنتِ رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کریں۔

اسی طرح کا معاملہ میرے آج کے موضوع کا ہے۔ اسلام میں اجتماعیت کی اساس

اوراس کے عملی طریقہ کار کو معلوم کرنے کے لیے سنتِ نبویؐ ہی سے اصل راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف عناصرِ ترکیبی کا تعلق ہے تو قرآن حکیم میں اس سے متعلق متعدد اشارے مل سکتے ہیں۔لیکن اگر ہم چاہیں کہ ہمارے سامنے اس موضوع کا ایک مکمل اور مربوط خاکہ آ جائے اور اس کے عملی خدوخال واضح ہو جائیں تو یہ سنتِ نبویؐ کی طرف رجوع کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے میں جس روایت کی طرف آپ کی توجہات کو مرکوز کرنا چاہتا ہوں وہ مشکوٰۃ المصابیح (کتاب الامارۃ) میں مسند احمد بن حنبلؒ اور جامع ترمذیؒ کے حوالے سے موجود ہے۔ اس روایت کے الفاظ انتہائی اہم ہیں۔حضرت حارث الاشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰهُ اَمَرَنِي بِهِنَّ :بِالْجَمَاعَةِ، وَالسَّمْعِ، وَالطَّاعَةِ، وَالْهِجْرَةِ، وَالْجِهَادِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (۱)

''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے۔یعنی جماعت، سننا، اطاعت کرنا، ہجرت، اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا''۔

میرا گمان ہے کہ آپ میں سے اکثر نے یہ حدیث پہلی مرتبہ سنی ہوگی۔اس روایت کا تقابل اگر آپ اس انتہائی مشہور روایت سے کریں جس میں اسلام کے پانچ ارکان کا ذکر ہے تو بظاہر ایک عجیب تضاد ہمارے سامنے آتا ہے۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ:شَهَادَةِ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَاِقَامِ الصَّلَاةِ، وَاِيْتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالْحَجِّ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۲)

''اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، (بیت اللہ کا) حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا''۔

(۱) سنن الترمذی، ابواب الامثال عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔ ومسند احمد، مسند الشامین:۱۶۷۱۸ واللفظ لہ۔

(۲) صحیح البخاری، باب بنی الاسلام علی خمس۔وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ارکان الاسلام ودعائمہ العظام۔

آپ جانتے ہیں کہ اسلام کے پانچ ارکان کا تصور اسی حدیث سے اخذ کیا گیا ہے، اور یہ کہ یہ حدیث انتہائی عام ہے، بار بار دہرائی جاتی ہے، اور مختلف طریقوں سے اس کا حوالہ آتا ہے۔حالانکہ اگر آپ اس روایت کے الفاظ پر غور کریں تو آپ صاف طور پر محسوس کریں گے کہ اس حدیث میں کوئی حکم نہیں دیا جارہا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے۔ یہ ایک حقیقت کا اظہار تو ہے لیکن کلام انشائیہ نہیں ہے، کوئی واضح حکم نہیں دیا جارہا ہے۔دوسری طرف وہ روایت دیکھئے جس کا میں نے حوالہ دیا ہے، اس میں صریح الفاظ اور انتہائی تاکیدی اسلوب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پانچ باتوں کا حکم دیا ہے، یعنی جماعت، سمع وطاعت، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔اس کے باوجود یہ حدیث وہ ہے جس سے لوگ بالعموم واقف نہیں۔مسلمانوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ اس روایت کے وجود ہی سے بے خبر ہیں۔ظاہر ہے کہ اس بے خبری کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔

اس موقع پر میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کروں۔ یہ تقریباً بیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔میرا اس حدیث کے ساتھ تعارف مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی مرحوم کے ذریعے ہوا۔مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں اپنے جریدے ''الہلال'' میں اور مولانا مودودی نے ۱۹۴۶ء میں مراد پور (سیالکوٹ) کی ایک تقریر میں (جو ''شہادتِ حق'' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے) اس حدیث کا حوالہ دیا تھا۔لیکن دونوں نے اس روایت کی سند اور حوالہ ذکر نہیں کیا کہ یہ حدیث کس کتاب سے لی گئی ہے۔ مجھے اس روایت میں خاصی دلچسپی تھی اور اسی تجسس کی وجہ سے میں نے ایک بڑے عالم دین سے رابطہ قائم کیا جو لاہور کے ایک دینی ادارے میں شیخ الحدیث تھے۔ چنانچہ میں نے ان سے اس حدیث کے ماخذ اور اسناد سے متعلق سوال کیا۔جواب میں انہوں نے کہا کہ اس روایت کے الفاظ نامانوس سے محسوس ہو رہے ہیں، مجھے یاد نہیں کہ یہ الفاظ میری نظر سے گزرے ہوں۔عجیب بات یہ ہے کہ یہ حدیث، جیسا کہ میں نے عرض کیا، مشکوٰۃ میں موجود ہے، جو علمِ حدیث کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔اس کے باوجود ایک

عالم نے' جو علمِ حدیث کے استاد اور اپنے فن میں ماہر سمجھے جاتے ہیں' اس روایت کو نامانوس قرار دیا۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ ایک نہایت اہم روایت عام مسلمانوں ہی کے نہیں' علماء کے شعور سے بھی محو ہو گئی! اس وجہ کو سمجھنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

اسلام ''مذہب'' کیونکر بنا؟

اسلام عام معنوں میں مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ مذہب کا لفظ عموماً نہایت محدود مفہوم میں مستعمل ہے' یعنی چند عقائد (dogma) ' پرستش یا عبودیت کے طریقے (rituals) اور چند سماجی رسومات (social customs)۔ اس سے زیادہ یا اس سے آگے بڑھ کر مذہب کی کوئی حیثیت تسلیم نہیں کی جاتی۔ چنانچہ جہاں تک سماجی' معاشی اور سیاسی نظام کا تعلق ہے تو آج کے دَور میں یہ مان لیا گیا ہے کہ ان تمام اُمور کا کوئی تعلق کسی مذہب یا کسی آسمانی ہدایت سے نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا دین......دینِ اسلام......ایک مکمل نظامِ حیات فراہم کرتا ہے اور یہ کہ اس میں ذاتی اور اجتماعی زندگی دونوں کے لیے مکمل ہدایات موجود ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمان اُمت کے زوال کی وجہ سے یہ بنیادی حقیقت بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے زوال کا جو عمل شروع ہوا' وہ رفتہ رفتہ یہاں تک پہنچا کہ دین کا یہ مفہوم کہ وہ ہمیں ایک کامل سماجی' معاشی اور سیاسی نظام بھی فراہم کرتا ہے' ہمارے اجتماعی شعور سے محو ہو گیا' اور ہم اسلام کو بھی معروف معنوں میں صرف ایک مذہب سمجھنے لگے۔

اس سلسلے میں مغربی استعمار کی غلامی کا بھی اہم کردار ہے۔ یہ وہ دور تھا جب عیسائیت جیسے ''مذہب'' سے ہمارا سابقہ پیش آیا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں' مسیحیت میں کوئی قانون یا شریعت نہیں ہے۔ پورا مذہب محض چند عقائد' چند اخلاقی تعلیمات اور تھوڑے بہت تصوف پر مشتمل ہے۔ نظامِ اجتماعی کی بات تو بہت دور کی ہے' مسیحیت میں تو کوئی قانون تک موجود نہیں ہے۔ مغرب کی غلامی کے دور میں ہم نے بھی یہی لفظ یعنی ''مذہب'' اختیار کر لیا' اور باوجودیکہ اس کا اصل انطباق تو مسیحیت پر ہوتا ہے' ہم نے اسلام کو بھی ایک ''مذہب'' کہنا اور سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان ملکوں پر مغربی قانون اور استعماری نظام کا غلبہ تھا' نظامِ اجتماعی کے کسی بھی گوشے کا تعلق اسلام سے باقی نہ رہا تھا' بلکہ ہر کام ہمارے غیر ملکی آقاؤں کی مرضی کے مطابق ایک لادینی نظام کے تحت ہوتا تھا۔ نظامِ اسلام جب ایک ٹھوس اور واقعی حقیقت کی صورت میں موجود نہ رہا تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے مصداق دین کا یہ تصور کہ وہ ایک مکمل نظام بھی ہے' ہماری نظروں سے غائب ہو گیا۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا اپنا ایک مکمل اور قابلِ عمل سیاسی' سماجی اور معاشرتی نظام بھی ہے تو بہت سے مسلمان بھی چونک جاتے ہیں۔

صدیوں کے مسلسل زوال کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام کا بحیثیتِ دین تصور ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چنانچہ مغربی استعمار کی غلامی کے دور میں بھی ہم مسلمانوں کو عقائد' نماز' روزے' زکوٰۃ' حج وغیرہ کی پوری آزادی تھی۔ ہمیں اجازت تھی کہ بچے کی پیدائش پر عقیقہ کریں' شادی کے موقع پر نکاح کا طریقہ اختیار کریں' فوتیدگی کی صورت میں تجہیز و تکفین کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تمام چیزیں......عقائد' عبادات' رسومات......تو ہماری نظروں میں رہیں' لیکن چونکہ اس دورِ غلامی میں ہمارا سماجی' معاشی اور سیاسی نظام برقرار نہ رہا' لہٰذا اسلام کے یہ پہلو ہمارے اجتماعی شعور سے غائب ہو گئے۔

ہجرت کا وسیع تر تصور

اب میں چاہوں گا کہ زیرِ بحث حدیث کے الفاظ پر غور کر لیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے جن پانچ باتوں کا حکم فرمایا ہے ہم ان کو عکسی ترتیب سے سمجھنے کی کوشش کریں گے' جس کی وجہ آگے چل کر واضح ہو جائے گی۔ آخری دو باتیں ہیں ہجرت اور جہاد۔ یہ دونوں دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اکثر ہم کسی بات کے منفی پہلو کو پہلے بیان کرتے ہیں اور مثبت کو بعد میں۔ مثلاً لا الٰہ الا اللہ میں بھی نفی پہلے ہے' اثبات بعد میں۔ پہلے تمام خداؤں کی نفی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے۔ اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ ہجرت ایک ہی حقیقت کا منفی پہلو ہے' اور اسی فریضہ کے مثبت پہلو کا نام جہاد ہے۔ ہجرت کا مطلب ہے کسی شے کو ترک کر دینا' اور جہاد کا

مفہوم ہے کسی شے کے لیے کوشش کرنا۔ چنانچہ یہ دونوں فرائض حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

ہجرت اور جہاد دونوں کے کئی مراحل اور درجات ہیں' لیکن میں آپ کے سامنے ان دونوں فرائض کے ابتدائی اور پھر آخری مراحل بیان کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ ابتدائی اور آخری مراحل سمجھ لینے کے بعد آپ درمیانی مراحل کا اندازہ خود ہی لگا لیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک بار یہ سوال پوچھا گیا کہ کون سی ہجرت سب سے افضل ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ: ((اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ عَزَّوَجَلَّ)) (۱) یعنی سب سے افضل ہجرت یہ ہے کہ تم ہر اُس شے کو چھوڑ دو جو تمہارے پروردگار کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔ اب آپ ذرا اس حدیث مبارک کے نتائج پر غور کریں۔ اگر کوئی شخص آج یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ ہر اُس شے کو ترک کر دے گا جو اللہ کو پسند نہیں تو گویا آج ہی سے اس کی ''ہجرت'' کا آغاز ہو جائے گا۔ اگر اس کے کاروبار میں سود کا کوئی حصہ ہے تو اسے چھوڑنا پڑے گا' اور اگر اس کی معاشرت میں کہیں احکامِ شریعت سے تجاوز ہو رہا ہے تو اس طرزِ معاشرت کو ترک کرنا پڑے گا' خواہ اُس شخص کو اپنے دوستوں اور عزیزوں کے استہزاء بلکہ مخالفت ہی کا نشانہ کیوں نہ بننا پڑے۔ چنانچہ ہجرت کا پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ انسان ہر اُس شے کو ترک کر دے جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

اب اس نکتے کو سمجھئے کہ ہجرت کا آخری مرحلہ یا ہجرت کے عمل کا نقطۂ عروج کیا ہے؟ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد ہم سب پر فرض ہے۔ اگر اس جدوجہد کے دوران ایسا موقع آ جاتا ہے کہ وطن اور گھر بار چھوڑ کر کسی خاص مقام پر جمع ہونے کی ضرورت پیش آ جائے تاکہ باطل کے خلاف آخری حملے کے لیے قوت فراہم کی جا سکے تو یہ ہجرت کی انتہائی شکل ہو گی۔ اگر ایسا موقع آ جاتا ہے تو ہر اُس شخص کے لیے جو اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف ہو' یہ لازم ہو گا کہ وہ اپنے گھر' اپنی جائیداد' اپنے دوستوں

(۱) سنن النسائی' کتاب البیعة' باب هجرة البادی۔

اور رشتہ داروں بلکہ اپنے محبوب وطن تک کو چھوڑ کر اللہ کے دین کے لیے نکل آئے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نقل مکانی اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے یا کسی بہتر اور آسودہ ماحول کی تلاش کے لیے نہیں' بلکہ صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہو گی۔

اس ہجرت کا تصور کیجئے جو نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف فرمائی تھی۔ انہوں نے اپنے گھروں اور اپنے مال و متاع کو چھوڑا' اپنے آباء و اَجداد کا شہر چھوڑا' انہوں نے وہ سرزمین چھوڑی جہاں ان کے باپ دادا کی ہڈیاں دفن تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے دنیا کا سب سے قیمتی اور مقدس مقام' خانہ کعبہ' تک چھوڑ دیا۔ تصور کیجیے کہ یہ ہجرت کس غرض کے لیے تھی؟ کیا یہ لوگ اپنا معیارِ زندگی بلند کرنا چاہتے تھے؟ کیا انہیں بہتر کاروباری مواقع کی تلاش تھی؟ کیا وہ دولت و جائیداد کے اعتبار سے پھلنا اور پھولنا چاہتے تھے؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی شے بھی ان کو مطلوب نہ تھی۔ ان کی یہ ہجرت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تھی' اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور مقصد ان کے سامنے نہ تھا۔

جہاد کے مختلف مراحل

اب اس تصویر کے دوسرے رخ پر اپنی توجہ کو مرکوز کیجیے۔ جہاد کا پہلا مرحلہ کیا ہے اور اس کی آخری منزل کون سی ہے؟ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا جہاد سب سے افضل ہے؟ حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس کے خلاف کشمکش کرو اور اسے اللہ تعالیٰ کا مطیع بنا دو۔ اسی طرح ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اصل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ نفس سے کیا مراد ہے؟ انسان کے وجود میں ایک شے تو اس کی فطرت ہے جو اس کی روح سے عبارت ہے' اور دوسرا اس کا نفسِ حیوانی ہے جو اس کے جبلی تقاضوں سے عبارت ہے۔ یہ حیوانی اور جبلی تقاضے اندھے ہیں' انہیں حرام و حلال سے غرض نہیں' بلکہ صرف اپنی تسکین چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان خواہشات کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسان لامحالہ گناہ اور فسق و فجور کے راستے پر پڑ جاتا ہے' لہٰذا لازم ہے کہ ہم ان

خواہشات کے خلاف کشمکش کریں اور انہیں اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تابع بنائیں۔ یہ کوشش اصل میں حضورﷺ کے قول کے مطابق جہاد کی پہلی سیڑھی ہے۔

اب اس بات کو سمجھئے کہ جہاد کا آخری مرحلہ یا جہاد کا نقطۂ عروج کیا ہے؟ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد ہم سب پر فرض ہے۔ اگر اس جدوجہد کے دوران ایسا موقع آ جاتا ہے کہ ہر وہ شخص جو اس جدوجہد میں مصروف ہو اس کے لیے لازم ہو جائے کہ وہ کفر اور شرک کی طاقتوں کے خلاف لڑنے کے لیے میدان میں آ جائے تو یہ جہاد کا آخری مرحلہ ہوگا۔ حضورﷺ نے فرمایا ہے کہ ''اگر ایک مسلمان اس حال میں مرجاتا ہے کہ اس نے نہ تو اللہ کی راہ میں کسی جنگ میں حصہ لیا اور نہ اس کے دل میں اس کی خواہش پیدا ہوئی تو وہ ایک قسم کے نفاق کی حالت میں مرا''(۱)۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ایمانِ حقیقی حاصل ہو اور اسے یہ علم ہو کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد اس پر فرض ہے' تو یہ آپ سے آپ لازم آ جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کی ایک شدید خواہش بھی اس کے دل میں موجود ہو۔ البتہ یہ عین ممکن ہے کہ اس شخص کی زندگی میں ایسے مسلح تصادم کا موقع ہی نہ آئے۔ جیسے کہ حضورﷺ کے بہت سے صحابہؓ ایسے تھے جو ہجرت سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ گویا ان کی زندگیوں میں قتال فی سبیل اللہ کا موقع ہی نہیں آیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس راہ میں لڑنے کی شدید آرزو ان کے دلوں میں یقیناً موجود تھی۔ اس لیے کہ اگر یہ آرزو کسی کے دل میں موجود نہ ہو تو اس کے ایمان ہی کی نفی کر دی گئی ہے۔

ہجرت و جہاد کی شرطِ لازم: التزامِ جماعت

یہاں یہ سوال اپنے سامنے رکھئے کہ کیا ہجرت اور جہاد کے یہ فرائض ایک منظّم اور متحد جماعت کے بغیر بھی ادا کیے جا سکتے ہیں؟ کیا کوئی شخص اپنی انفرادی حیثیت میں ہجرت اور جہاد کا حق ادا کر سکتا ہے؟ آپ اپنے نفسِ اَمارہ کے خلاف تو کشمکش تنہا رہ کر بھی کر سکتے ہیں' لیکن کیا اللہ کے دین کی اقامت اس طرح ممکن ہے؟ کیا کوئی فرد اپنی ذاتی

(۱) صحیح مسلم' کتاب الجهاد' باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسه بالغزو۔ عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ۔

حیثیت میں اتنا طاقتور ہو سکتا ہے کہ وہ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو محض اپنے زورِ بازو سے نافذ کر سکے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب صرف نفی میں ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اگر ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کرنا ہے تو یہ کام ایک منظّم جماعت کے بغیر ناممکن ہے۔ اگر اقامتِ دین کی جدوجہد فرض ہے تو یہ فرض ایک منظّم جماعت کے بغیر محض انفرادی طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا' اس کے لیے ایک جماعت کا ہونا لازم ہے۔ چنانچہ زیر مطالعہ حدیث میں یہ نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ حضورﷺ نے سب سے پہلے جس بات کا مسلمانوں کو حکم دیا وہ التزامِ جماعت ہے۔ یعنی مسلمانوں کے لیے یہ شے لازم کی گئی کہ وہ اپنے آپ کو ایک جماعت کی شکل میں منظّم رکھیں۔ یہ جماعت اور اس کا نظم اس لیے مطلوب ہے کہ آخری دو فرائض یعنی ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ کو کما حقہٗ ادا کیا جا سکے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت کے لیے میں چاہوں گا کہ آپ کے سامنے چند اور احادیث بھی آ جائیں جن میں جماعت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

امام ترمذیؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا:

((عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَةِ' وَاِیَّاکُمْ وَالْفُرْقَةَ' فَاِنَّ الشَّیْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ' وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ)) (۱)

''تم پر جماعت کی شکل میں رہنا فرض ہے' اور تم تنہا مت رہو' اس لیے کہ اکیلے شخص کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے' لیکن اگر دو (مسلمان) ساتھ رہیں تو وہ دُور ہو جاتا ہے۔''

اس حدیث میں حضورﷺ نے مسلمانوں کو واضح طور پر خبردار کیا ہے کہ اگر ایک مسلمان جماعت سے الگ رہتا ہے تو شیطان اسے اپنا شکار بنا لیتا ہے اور صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیتا ہے۔

ایک دوسری روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے فرمایا:

((یَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ وَمَنْ شَذَّ شَذَّ اِلَی النَّارِ)) (۲)

(۱) سنن الترمذی' ابواب الفتن عن رسول اللّٰہﷺ' باب ما جاء فی لزوم الجماعة۔
(۲) سنن الترمذی' ابواب الفتن عن رسول اللّٰہﷺ' باب ما جاء فی لزوم الجماعة۔

''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ جو شخص خود کو جماعت سے کاٹ لیتا ہے وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔''

مراد یہ ہے کہ اللہ کی مدد اور حمایت مسلمانوں کی اجتماعیت کے لیے ہے نہ کہ افراد کے لیے۔ اگر ایک شخص اجتماعیت سے خود کو کاٹ لیتا ہے تو پہلی حدیث کی رُو سے وہ شیطان کے لیے نرم چارہ ثابت ہوتا ہے جو اسے صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیتا ہے' اور اس طرح آخرت میں ایسا شخص جہنم کا مستحق بنتا ہے۔

اس سلسلے کی تیسری روایت اصل میں حضرت عمر فاروق ؓ کا قول ہے (اور علم حدیث کی رو سے یہ بھی ''حدیث'' ہی ہے)۔ حضرت عمر ؓ فرماتے ہیں:

((اِنَّہٗ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَۃٍ وَلَا جَمَاعَۃَ اِلَّا بِاِمَارَۃٍ وَلَا اِمَارَۃَ اِلَّا بِطَاعَۃٍ)) (۱)

''یہ ایک حقیقت ہے کہ جماعت کے بغیر اسلام نہیں ہے' اور امارت کے بغیر جماعت نہیں ہے' اور امارت کا کوئی فائدہ نہیں اگر اس کے ساتھ اطاعت نہ ہو''۔

دین میں اجتماعیت کی اہمیت

آگے بڑھنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے ہمارے دین کے مزاج کی ایک جھلک آ جائے۔ میں نے شروع میں اس اہمیت کی طرف اشارہ کیا تھا جو ہمارا دین نماز کو دیتا ہے۔ مردوں کے لیے فرض نمازیں باجماعت ادا کرنا لازم کیا گیا ہے' سوائے اس کے کہ کوئی حقیقی عذر لاحق ہو۔ جماعت کی شکل میں نماز ادا کرنا دراصل اس امر کی ایک علامت ہے کہ اسلام تمام معاملات میں ایک طرح کا عمومی نظم چاہتا ہے۔

باجماعت نماز میں کیا ہوتا ہے؟ ایک امیر یا امام ہے جس کی تمام نمازیوں کو پیروی کرنا ہوتی ہے۔ کسی نمازی کو اجازت نہیں کہ وہ نماز کا کوئی رکن امام سے پہلے ادا کر لے۔ اگر کوئی شخص امام سے پہلے اپنا سر سجدے سے اٹھا لے تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ انتہا یہ ہے کہ اگر امام نماز پڑھانے میں کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے تو آپ کو اس کی اجازت تو ضرور ہے کہ سبحان اللہ کہہ کر اسے متوجہ کریں' لیکن اگر وہ اپنی غلطی پر قائم رہتا ہے تو آپ کو جماعت چھوڑ دینے کی ہرگز اجازت نہیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ کو سو فیصد

(۱) سنن الدارمی' المقدمۃ' باب فی ذھاب العلم۔

یقین ہو کہ امام سے غلطی کا صدور ہو رہا ہے تب بھی آپ جماعت چھوڑ کر الگ نہیں ہو سکتے' بلکہ ضروری ہے کہ آپ لازماً جماعت کے ساتھ رہیں اور امام کی غلطی میں بھی اس کی پیروی کریں۔ جماعت کی اہمیت یہ ہے کہ آپ کو اس کے ساتھ اپنے آپ کو پیوستہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے خواہ آپ اپنے امام سے اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔

دوسری مثال اسلام کے سماجی نظام سے لیجیے' جس کی بنیاد ''نکاح'' کے ادارے کے ذریعے استوار ہوتی ہے۔ نکاح کیا ہے؟ ایک عورت اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ وہ شریعت کے دائرے کے اندر اندر اپنے شوہر کی اطاعت کرے گی اور اپنے آپ کو نکاح کے لیے پیش کرتی ہے۔ ایک مرد اس پیشکش کو قبول کرتا ہے اور اس طرح نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ غور کیجیے کہ فی الواقع اگر آپ کو ایک مضبوط اور صحت مند خاندانی نظام تشکیل دینا ہے تو یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اطاعت فی المعروف اور نظم کو بھرپور طریقے سے قائم کیا جائے۔ اسی لیے اسلام نے بیوی پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت کرے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ بیوی اپنے شوہر سے اختلاف کر سکتی ہے' اس کی رائے بدلنے کی کوشش کر سکتی ہے' وہ اپنے شوہر کو مشورہ یا تجویز دے سکتی ہے' وہ دلائل کے ذریعے بات کر سکتی ہے یا استدعا اور درخواست کر سکتی ہے' لیکن اگر وہ اپنے شوہر کی اطاعت پر کاربند نہیں تو یہ رویہ اسلامی تعلیمات کے منافی سمجھا جائے گا۔

ایک تیسری مثال لیجیے۔ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اگر دو افراد بھی اکٹھے سفر کر رہے ہوں تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنے میں سے زیادہ تجربہ کار اور باعلم شخص کو امیر مقرر کر لیں' جو دوسرے مسافر کی رہنمائی کرے۔ اسی طرح اگر دو افراد ساتھ ہوں اور نماز ادا کرنے کا موقع آ جائے تو ان میں سے ایک کو امام بن جانا چاہیے اور دوسرے کو مقتدی۔ ان مثالوں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں اجتماعیت کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ نیز ان سے اسلام میں اجتماعی زندگی کے نظام پر روشنی پڑتی ہے' جو ہمارا اگلا موضوع ہے۔

نظم جماعت کی مختلف شکلیں

اسلام میں اجتماعی زندگی کے مزاج کو درست طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے سامنے اس نظام کا خاکہ بھی رہے جو دنیا میں عموماً اختیار کیا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کی دنیا میں کئی طرح کے ادارے' جماعتیں' انجمنیں وغیرہ قائم کی جاتی ہیں۔ یہ سب اجتماعیت ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں دو امور نہایت اہم ہوتے ہیں' اوّلاً تاسیسی یادداشت جس میں اس ادارے' جماعت' یا انجمن کے اغراض و مقاصد بیان کیے جاتے ہیں اور ثانیاً اس کا دستور۔ جہاں تک دستور کا تعلق ہے' ہم دیکھتے ہیں کہ قریب قریب ایک جیسے قواعد وضوابط ہیں جو مختلف قسم کے اداروں کے دساتیر میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ رکنیت کی شرائط ہوتی ہیں۔ پھر ارکان کسی صدر یا چیئرمین کو منتخب کرتے ہیں۔ پھر مجلس عاملہ یا شوریٰ کے انتخاب کے لیے قواعد ہوتے ہیں۔ آخر میں اختیارات کی تقسیم کا معاملہ طے کیا جاتا ہے اور Checks and balances کا نظام وضع ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعتیں نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی ہیں۔ اس طریق کار میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جسے قرآن یا سُنّت کی بنیاد پر غلط کہا جا سکے۔ تنظیم یا اجتماعیت کی یہ صورتیں قطعی طور پر جائز اور مباح ہیں۔

جو نکتہ میں واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگرچہ جماعت سازی کا یہ نظام جو آج دنیا میں عام طور پر پایا جاتا ہے خلافِ اسلام نہیں' تاہم اس نظام کے حق میں کوئی دلیل نہ قرآن مجید سے ملتی ہے اور نہ سنّتِ رسول ﷺ سے۔ اس کے باوجود میری رائے یہی ہے کہ یہ طریقہ غیر اسلامی یا غیر شرعی ہرگز نہیں۔ یہ رائے دراصل فقہ کے ایک بنیادی اصول پر مبنی ہے' یعنی ہر کام مباح اور جائز سمجھا جائے گا جب تک کہ اس کا حرام ہونا کسی شرعی دلیل سے ثابت نہ کر دیا جائے۔

اس کے برعکس جماعت سازی کا جو طریقہ ہمیں قرآن پاک سے ملتا ہے' جو حضور ﷺ کی سیرت اور سنت سے ملتا ہے اور جو اُمت مسلمہ کی تیرہ سوسالہ تاریخ میں ملتا ہے' وہ اس طریقے سے بالکل مختلف ہے جو آج کی دنیا میں عموماً رائج ہے۔

اسلامی اجتماعیت کی دو بنیادی اصطلاحات

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ اسلامی اجتماعیت سے متعلق بعض بنیادی اصطلاحات کو سمجھ لیا جائے۔

۱۔ امیر: اس ضمن میں پہلی اصطلاح ہے امیر۔ امیر سے کیا مراد ہے؟ آپ کے علم میں ہے کہ لفظ امیر سے ملتا جلتا ایک اور لفظ اردو میں مستعمل ہے' یعنی آمر۔ آمر کا لفظ انگریزی لفظ Dictator کے مترادف کے طور پر بولا جاتا ہے اور یہ لفظ کبھی بھی اچھے معنوں میں نہیں آتا۔ اگر آپ کسی قائد یا رہنما کو ''آمر'' کہہ دیں یا اس کے رویے کو ''آمرانہ'' قرار دیں تو گویا یہ ایک شدید تنقید سمجھی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آج ایک ایسے دَور میں سانس لے رہے ہیں جو جمہوریت اور عوام کی حاکمیت کا دور ہے' اور اس ماحول میں کوئی بھی ایسی شے پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی جو سلطانیٔ جمہور کے اونچے تصورات سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ لیکن نوٹ کیجیے کہ امیر کا لفظ آمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ گاڑھا ہے۔

عربی زبان کی باریکیوں سے واقفیت رکھنے والے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیں گے کہ جب کوئی شخص ایک کام کر رہا ہو تو اسے ''فاعل'' کہتے ہیں' مثلاً قادر' عالم' آمر وغیرہ' لیکن جب اس کام کو کرنے کی صلاحیت اور صفت اس شخص میں مستقل طور پر پائی جائے اور اس کی شخصیت کا مستقل جزو بن جائے تو پھر اسے ''فعیل'' کہتے ہیں' مثلاً قدیر' علیم' اور امیر۔ چنانچہ دوبارہ نوٹ کیجیے کہ جس حدیث کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں اس میں قائد یا رہنما کے لیے لفظ ''امیر'' استعمال ہوا ہے جو آمر سے کہیں زیادہ گاڑھا ہے۔

حضرت ابوہریرہ ؓ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں: ''جس نے میری اطاعت کی اس نے اصل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے (میرے مقرر کیے ہوئے) امیر کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے (میرے مقرر کیے ہوئے) امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی''۔(۱)

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب تعامل من وراء الامیر ویتقی به۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة......

ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں بنفسِ نفیس موجود تھے تو آپؐ خود ہی مسلمانوں کے امیر بھی تھے' فوج کے سپہ سالار بھی تھے' اور سربراہِ حکومت بھی تھے۔ لیکن اُس وقت بھی آپؐ کے مقرر کردہ امراء کا ایک پورا سلسلہ موجود تھا اور یہ امراء مختلف سطحوں پر نگران اور قائد تھے۔ مثال کے طور پر اگر کسی غزوے کا موقع ہو تو ظاہر ہے کہ فوج کے سپہ سالار تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی تھے' لیکن پھر آپؐ کے تحت دوسرے امراء بھی مقرر ہوتے تھے' مثلاً میمنہ کا امیر' میسرہ کا امیر' وغیرہ۔ پھر ان بڑی شاخوں کے آگے چھوٹی شاخیں اور ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ امیر کا تقرر ہوتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امراء کی ایک پوری زنجیر تھی اور اس زنجیر کو برقرار رکھنا ضروری تھا۔ اگر اس سلسلے میں کہیں کوئی خرابی ہوتی تو لازماً منفی نتائج برآمد ہوتے۔ چنانچہ یہی چیز غزوۂ اُحد میں پیش آئی۔

غزوۂ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ ایک پہاڑی درّے پر مقرر فرمایا اور حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو اس کا امیر بنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ تم یہاں سے ہرگز مت ہلنا' یہاں تک کہ اگر تم دیکھو کہ تمام مسلمان مارے گئے ہیں تب بھی تم اپنی جگہ مت چھوڑنا۔ جنگ کے دوران جب تیر اندازوں نے دیکھا کہ دشمن مغلوب ہو گیا ہے تو انہوں نے اپنے امیر یعنی حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کے روکنے کے باوجود اپنی جگہ چھوڑ دی۔ میری رائے یہ ہے کہ تیر اندازوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تاویل کی' اور یہ سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم صرف اس صورت میں تھا اگر مسلمانوں کو شکست کا سامنا ہوتا' لیکن یہاں تو ہمیں فتح مل رہی ہے۔ چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں بلکہ اپنے مقامی امیر کی حکم عدولی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کے گھڑسواروں نے موقع غنیمت جان کر مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا اور شدید نقصان پہنچایا۔ پینتیس صحابہؓ کی غلطی کی وجہ سے ستر صحابہ شہید ہوئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمان افواج پر واضح کر دیا کہ نظم کی کیا اہمیت ہے اور امیر کا حکم نہ ماننے کی کس طرح سزا ملتی ہے۔

غور کیجیے کہ اسلام نظم اور تنظیم کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کا معاملہ تو یہ تھا کہ آپ کو براہِ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا۔ بعد میں صورت حال یہ رہی کہ مسلمان خود اپنے خلیفہ یا امیر کو باہمی مشورے کے ذریعے منتخب کرتے تھے۔ لیکن ایک حدیث کے مطابق' جس کے راوی حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ (اے مسلمانو!) تم پر سمع و طاعت لازم ہے خواہ کوئی غلام ہی تمہارا امیر بن بیٹھے[1] (یعنی مسلمانوں کی مرضی کے بغیر) بشرطیکہ وہ تمہیں کوئی خلافِ شریعت حکم نہ دے۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں اجتماعیت اور نظم کی کیا اہمیت ہے کہ اگر کوئی شخص زبردستی حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے تب بھی شریعت کے دائرے کے اندر اس کی اطاعت کی جائے گی۔ مقصد یہ ہے کہ غیر ضروری فتنہ وفساد سے اُمت کو بچایا جائے۔ امیر کے حکم کی نافرمانی صرف اسی صورت میں جائز

---

(۱) حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی یہ روایت حافظ ابن قیمؒ نے ''اعلام الموقعین'' (۱۱۹/۴) میں اور حافظ منذریؒ نے ''الترغیب والترھیب'' (۶۰/۱) میں درج کی ہے اور علامہ البانیؒ نے ''صحیح الترغیب والترھیب'' میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اسے امام نوویؒ نے اپنی ''اربعین'' میں ترمذی اور ابوداوٗد کے حوالے سے درج کیا ہے (حدیث ۲۸)۔ اس روایت کے الفاظ ہیں: ((اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ تَأَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ...... الخ)) ''یعنی ''میں تمہیں خدا ترسی کی نصیحت کرتا ہوں اور سننے اور ماننے کی' خواہ تم پر ایک غلام ہی امیر بن بیٹھے......'' لیکن ترمذی اور ابوداوٗد کے علاوہ سنن ابن ماجہ' مسند احمد اور سنن دارمی میں بھی عرباض بن ساریہؓ کی روایت جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے ان میں ''تأمّر علیکم'' کے الفاظ شامل نہیں ہیں۔ تاہم امام نوویؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں اسی مضمون کی ایک اور حدیث مبارک ((وَلَوِ اسْتُعْمِلَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ یَقُوْدُکُمْ بِکِتَابِ اللّٰہِ فَاسْمَعُوْا لَہٗ وَاَطِیْعُوْا)) کے ذیل میں لکھا ہے کہ ''ایک غلام اگر غلبہ حاصل کر کے از خود امیر بن بیٹھے اور امورِ سلطنت کتاب وسنت کے مطابق انجام دے تو اس کی اطاعت لازم ہے۔ البتہ عام حالات میں جبکہ امیر کا انتخاب مسلمانوں کی آزادانہ رائے سے ہو رہا ہے' کسی غلام کو امیر منتخب کرنا درست نہیں ہوگا''۔ (حاشیہ از ناشر)

ہے اگر وہ واضح طور پر شریعت سے تجاوز کرے' اور مسلح بغاوت اسی صورت میں صحیح ہوگی اگر ایک پائیدار تبدیلی برپا کر دینے کے لیے کافی طاقت فراہم ہو چکی ہو۔

خود سے امیر بن جانے کی ایک صورت اور بھی ممکن ہے' مثلاً میں بھی امیر ہوں' حالانکہ کسی نے مجھے منتخب نہیں کیا ہے۔ میں پاکستان میں ایک انقلابی جدوجہد کے ذریعے اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی' یا دوسرے لفظوں میں نظامِ خلافت' قائم کرنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ مجھ اکیلے کے بس کی بات نہیں۔ مجھے ساتھی اور اعوان وانصار درکار ہیں۔ میں عوام میں اپنے خیالات کو عام کرتا ہوں اور پھر یہ پکار لگاتا ہوں کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ؟ کون لوگ اس کام میں میرے دست و بازو بننے کو تیار ہیں؟ کون لوگ اللہ کی حاکمیت کو بالفعل قائم کرنے کے کام میں میری مدد کریں گے؟ اب جو افراد بھی مجھ سے اتفاق کرتے ہیں اور میرے بتائے ہوئے طریق کار کو درست سمجھتے ہیں' وہ میرے ساتھ مل جاتے ہیں' میرے ساتھی اور اعوان وانصار بن جاتے ہیں۔ اس طرح کی جماعت اُوپر سے نیچے کی طرف بڑھتی ہے۔ چونکہ لوگ میری پکار پر جمع ہوئے ہیں لہٰذا میں خود بخود امیر بن جاتا ہوں' اور کسی قسم کے انتخاب کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اب آپ ان چار اقسام کے امراء کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اولاً وہ امیر جسے کوئی بڑا امیر کسی خاص علاقے یا کسی مخصوص گروہ کا قائد مقرر کرے۔ مثلاً وہ امراء جنہیں رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا تھا۔ ثانیاً وہ امیر جسے مسلمان باہمی مشورے اور رضا مندی سے اپنا حاکم منتخب کریں۔ مثلاً خلفائے راشدینؓ۔ ثالثاً وہ شخص جو مسلمانوں کی مرضی کے بغیر حکومت پر قبضہ کر کے ان کا حاکم بن جائے۔ مثلاً مسلمانوں کی تاریخ کے اکثر بادشاہ اور آج کے دور کے فوجی حکمران۔ رابعاً وہ شخص جو اسلام کے لیے کسی جدوجہد کا آغاز کرنا چاہے اور اس میں اسے دوسرے مسلمانوں کی مدد اور ان کے تعاون کی ضرورت ہو۔ یہ شخص ابتدا میں داعی کے طور پر کام کرتا ہے اور لوگوں کو جمع کرنے کے لیے پکار لگاتا ہے۔ جب لوگ جمع ہو کر اس کے ساتھی بن جاتے ہیں تو وہ ان کا فطری امیر بن جاتا ہے۔

۲۔ سمع و طاعت: امیر کے بعد دوسری اصطلاح جس کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے' وہ ہے ''سمع و طاعت''۔ واضح رہے کہ جس طرح ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' بظاہر دو کام ہیں لیکن اصلاً ایک ہی اصطلاح بنتے ہیں' اسی طرح سمع و طاعت بھی قرآن حکیم کی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے دونوں اجزاء باہم پیوست ہیں اور جدا نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ سمع و طاعت دراصل فوج کے نظم کو ظاہر کرنے کی خاص اصطلاح بھی ہے۔ ایک عام سپاہی کا فرض یہ ہے وہ سنے اور اطاعت کرے۔ یعنی یہ کہ وہ اپنے سے بالاتر افسر سے احکامات وصول کرے اور ان پر عمل پیرا ہو۔ اسے اس کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنے کمانڈر سے بحث کرے اور اس کے حکم کی علت یا مقصد دریافت کرے۔ ظاہر ہے کہ ایک جنگ کے دوران وہی سپاہی کارآمد ثابت ہوں گے جو کیا اور کیوں کی بحث میں پڑنے کے بجائے اپنے افسر کے احکامات کو سنیں اور عمل کریں۔ فوج کا یہی وہ نظم ہے جسے ایک مشہور انگریزی نظم Charge of the Light Brigade میں بیان کیا گیا ہے۔ کسی لڑائی کے دوران صورت حال یہ ہوئی کہ فوج کے ایک دستے کو آگے بڑھنے کا حکم ملا' لیکن دشمن کی توپیں ہر طرف موجود تھیں۔ ہر سپاہی سمجھ رہا تھا کہ آگے بڑھنے کا حکم صریحاً کسی غلطی کا نتیجہ ہے' لیکن اس کے باوجود کسی نے بحث نہیں کی' کسی نے وضاحت طلب نہیں کی' اور کسی نے حکم کے صحیح یا غلط ہونے کا سوال نہیں اٹھایا۔ سب نے حکم کی تعمیل کی اور سب کے سب مارے گئے۔

Their's not to reason why,
Their's but to do and die!

اس موقع پر میں قرآن مجید کے تین مقامات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں' تاکہ سمع و طاعت کی جو اہمیت اسلام کے نظامِ زندگی میں ہے وہ پوری طرح واضح ہو جائے۔

﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾﴾ (البقرۃ)

''...... اور کہہ اُٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا' ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا

﴿وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾ (المائدة)

''اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر اور عہد اس کا جو تم سے ٹھہرایا تھا جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' بیشک اللہ خوب جانتا ہے دلوں کی بات۔''

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ﴾

(التغابن:۱۶)

''سو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جہاں تک ہو سکے' اور سنو اور مانو' اور خرچ کرو اپنے بھلے کو......''

اسلام میں نظمِ جماعت کی اساس

جیسا کہ میں نے عرض کیا' جماعت سازی کا جو طریقہ ہمیں قرآن میں ملتا ہے' رسول اللہ ﷺ کی سُنّت میں نظر آتا ہے' اور اُمتِ مسلمہ کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں جس کی مثالیں ملتی ہیں وہ صرف ایک ہے۔ یہ طریقہ بیعت کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ بیعت سے کیا مراد ہے؟

عربی میں بَاعَ یَبِیعُ کے معنی ہیں بیچنا۔ اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بیچنے کا عمل دوطرفہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی اصل ''تبادلہ'' ہے۔ مثلاً آپ روپے دے کر آٹا حاصل کر لیتے ہیں' اور کرنسی کی ایجاد سے پہلے ایک جنس کے تبادلے میں دوسری جنس حاصل کی جاتی تھی۔ یہاں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ آپ روپے کو قیمت سمجھیں اور آٹے کو جنس یا آٹے کو قیمت قرار دیں اور روپے کو جنس کہہ لیں۔ وجہ یہ ہے کہ جہاں بھی بیچنے کا عمل ہوگا وہاں خریدنے کا عمل بھی لامحالہ ہوگا۔

اس تفصیل سے میرا مقصد یہ ہے کہ آپ سورۃ التوبہ کی اس آیت کے اصل مفہوم کو اور اس آیت کی شان اور عظمت کو سمجھ سکیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾ (التوبة)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔ وہ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ وعدہ ہو چکا اللہ کے ذمہ پر سچا تورات اور انجیل اور قرآن میں' اور کون ہے جو اپنے وعدے کا پورا کرنے والا ہو اللہ سے بڑھ کر؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اُس سے کیا ہے' اور یہی ہے بڑی کامیابی۔''

یہ آیت قرآن مجید کی اہم ترین آیات میں سے ایک ہے۔ بدقسمتی سے آج ہماری زندگیوں میں اس آیت کی وہ اہمیت نہیں رہی جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں اس کو حاصل تھی۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ مؤمن اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس سودے میں اللہ تعالیٰ خریدار ہے اور مؤمن فروخت کرنے والا ہے۔ ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو' اپنی صلاحیتوں اور اوقات کو' اپنے وسائل اور اموال کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں کھپا دینے کے لیے آمادہ ہے' اور ان تمام قربانیوں کے عوض اس سے موت کے بعد کی زندگی میں جنت کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ یہ وہ سودا ہے جو مؤمن اور اللہ تعالیٰ کے مابین انجام پاتا ہے۔ اس سودے کے نتیجے میں اہلِ ایمان اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں' تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔ اس جنگ میں وہ اللہ کے دشمنوں کو بھی قتل کرتے ہیں اور خود بھی قتل ہوتے ہیں۔

یہ سودا جو ایک مؤمن اور اللہ تعالیٰ کے مابین ہوتا ہے نقد کا نہیں بلکہ ادھار کا معاملہ ہے۔ مؤمن سے مطالبہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسے اللہ کی راہ میں صرف کر دے۔ اور جواباً اسے ملتا کیا ہے؟ محض ایک وعدہ! اللہ کی طرف سے یہ وعدہ کہ اسے اس کی محنت اور قربانی کا صلہ آخرت میں ملے گا۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے کو دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اس معاملے میں کافی خطرہ (risk) نظر آتا ہے۔ اگر میں اپنا سب کچھ یہاں اللہ کی راہ میں قربان کر دوں اور موت کے بعد مجھے اس کا صلہ نہ ملے تب تو یہ گھاٹے کا سودا ہوا۔ اس طرح تو میں دنیا میں بھی نقصان میں رہا اور آخرت میں بھی۔

ظاہر ہے کہ ادھار کے سودے میں شکوک وشبہات کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہایت شدّ ومدّ کے ساتھ فرمایا ہے کہ اس وعدے کا پورا کرنا اس نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ لہٰذا کسی کو اس معاملے میں ہرگز متزلزل نہ ہونا چاہیے۔ یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے اور وہ لازماً اسے پورا کرے گا۔ اس نے یہ وعدہ تین مرتبہ کیا ہے' تورات میں' انجیل میں' اور پھر قرآن مجید میں۔ اور اللہ سے زیادہ اپنے قول کا سچا اور وعدے کا پورا کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے؟ لہٰذا اس سودے پر جو تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہے خوشیاں مناؤ۔ تم سے جو کچھ قربان کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ نہایت حقیر شے ہے' اور جس کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ابدی راحت ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے جو کسی انسان کو حاصل ہوسکتی ہے۔

سورۃ التوبہ کی یہ آیت لفظ اِشْتَرٰی سے شروع ہو کر بَیْعِکُمْ پر ختم ہوتی ہے۔ ان دونوں الفاظ میں کیا فرق ہے؟ اِشْتَــرٰی کا مطلب ہے خریدنا' اور بیع سے مراد وہ تبادلہ ہے جو دو اشخاص کے مابین ہوتا ہے اور جسے ہم ''خرید وفروخت'' کہتے ہیں۔ عربوں کا عام رواج تھا کہ جب ان کے درمیان خرید وفروخت کا معاملہ ہوتا تو وہ پہلے تو قیمت اور جنس کی خوبیوں یا خامیوں کے متعلق بحث کرتے' اور جب معاملہ طے پا جاتا تو وہ ہاتھ ملا کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اب کوئی فریق سودے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ یہ آخری معاہدہ' جس کی علامت کے طور پر ہاتھ ملائے جاتے تھے' مبایعت کہلاتا ہے' اور یہی وہ چیز ہے جو بیعت کی بنیاد بنی۔

قرآن وسنت میں بیعت کا ثبوت

یہاں اہم بات یہ ہے کہ یہ سودا اصل میں تو اللہ تعالیٰ اور مؤمن کے درمیان ہوتا ہے' لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ بذاتہٖ اور براہِ راست یہ سودا نہیں کرتا' لہٰذا ہمیں ایک درمیانی فریق کی ضرورت پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤمن کی جان و مال کا خریدار ہے' اور مؤمن اس سودے کے لیے تیار ہے' لیکن یہ سودا کس طرح انجام پائے گا؟ مؤمن کو کون بتائے گا کہ اسے کب اور کس طرح اپنی جان اور اپنے مال کو پیش کرنا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ مکی زندگی کے بارہ برسوں میں حکم یہ تھا کہ کوئی مزاحمت یا جوابی کارروائی نہیں کرنا ہے۔ پھر مدینہ میں جا کر حکم ملا کہ اب تصادم اور جنگ کا مرحلہ آ گیا ہے۔ لیکن یہ تمام احکام کس نے دیے؟ اس موقع پر تنظیم اور امیر اور سمع وطاعت کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔

یہ سارا معاملہ فی الواقع بہت منطقی اور سادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ خریدار ہے' مؤمن اپنے جان و مال کو جنت کے عوض فروخت کر رہا ہے' اور ان دونوں کے درمیان رسول اللہ ﷺ تھے۔ اصل خریدار تو اللہ تعالیٰ ہے' لیکن اطاعت کا وعدہ حضور ﷺ سے کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ ۚ فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰہَدَ عَلَیْہُ اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۰﴾﴾ (الفتح)

''(اے نبیؐ) جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا' اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ عنقریب اسے بڑا اجر عطا فرمائے گا۔''

معلوم ہوا کہ یہ اصل میں ایک سہ فریقی معاہدہ ہے' جان و مال کا سودا تو اللہ تعالیٰ اور مؤمن کے درمیان طے پایا' لیکن اطاعت کا وعدہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے ہوا۔ مطلب یہ کہ گویا مؤمن رسول اللہ ﷺ سے عرض کرتا ہے کہ میری زندگی اور میرا مال آپؐ کی خدمت میں پیش ہیں' جس طرح آپ حکم دیں گے ویسے ہی ان چیزوں کو قربان کردوں گا۔ اس میں آخری مقصد رضائے الٰہی کا حصول اور اُخروی کامیابی ہے۔

وہ بیعت جو رسول اللہ ﷺ نے مسلمان مَردوں سے لی تھی' اس کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے' اگرچہ احادیث میں اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاہم وہ بیعت جو حضور ﷺ نے خواتین سے لی تھی' اس کا ذکر واضح الفاظ میں قرآن حکیم میں موجود ہے۔

﴿یٰٓاَیُّہَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَکَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ

شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْـنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ (الممتحنة)

’’اے نبیؐ! جب تمہارے پاس مؤمن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی‘ چوری نہ کریں گی‘ زنا نہ کریں گی‘ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی‘ اور اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی‘ اور کسی امرِ معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی‘ تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو‘ یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا رحم کرنے والا ہے‘‘۔

سیرتِ نبویؐ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد جو سب سے اہم بیعت ہوئی ہے وہ ’’بیعتِ رضوان‘‘ ہے‘ جو رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ سے متصلاً قبل صحابہؓ سے لی تھی۔ تاہم ہجرت سے پہلے کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ دو نہایت اہم مواقع پر بیعت ہوئی ہے۔ یعنی جب یثرب سے آنے والوں نے حضور ﷺ سے قول و قرار کیا۔

منیٰ کا جو مقام مکہ سے قریب ترین ہے وہ وادیٔ عقبہ ہے‘ جہاں حج کے موقع پر یثرب کے چھ افراد نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات پر اسلام قبول کیا۔ اگلے برس ان میں سے پانچ افراد دوبارہ حج پر آئے اور سات مزید افراد کو ہمراہ لائے۔ اس موقع پر ان بارہ افراد نے حضور ﷺ سے وہ قول و قرار کیا جسے بیعتِ عقبہ اولیٰ کہا جاتا ہے۔ اس بیعت کے الفاظ وہی تھے جو بیعت النساء کے حوالے سے سورۃ الممتحنہ میں وارد ہوئے ہیں۔ اس سے اگلے برس بہتر مرد اور دو خواتین یثرب سے آئے اور انہوں نے حضور ﷺ سے وہ عہد کیا جسے بیعتِ عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ اس دوسری بیعت کے الفاظ نہایت اہم ہیں‘ جنہیں ہم ابھی بیان کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے مختلف اوقات میں کئی قسم کے عہد لیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی کسی مضبوط وعدے کی ضرورت پیش آئی تو حضور ﷺ نے ہمیشہ بیعت ہی کا معاملہ فرمایا۔ چنانچہ علم حدیث کے ایک عظیم عالم امام نسائیؒ نے دس مختلف اقسام کی بیعتوں کا ذکر کیا ہے جو حضور ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے لی تھیں: (۱) سمع و طاعت کی بیعت (۲) ہمیشہ سچ بولنے پر بیعت (۳) اس بات پر بیعت کہ حضور ﷺ کو صحابہ میں سے کسی کو بھی ترجیح دینے کا اختیار ہوگا (۴) اس بات کا عہد کہ ہم میدانِ جنگ سے نہ بھاگیں گے (۵) اس بات کا وعدہ کہ ہم جہاد کریں گے (۶) اس بات پر بیعت کہ ہمیشہ عدل پر مبنی بات کہیں گے (۷) ہر مسلمان کی خیر خواہی کی بیعت (۸) اللہ کے راستے میں جان قربان کرنے پر بیعت (۹) اس بات کا عہد کہ ہم حضور ﷺ کے حکم پر اپنے گھروں کو چھوڑ دیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ لینے اور نظم قائم کرنے کا واحد طریقہ جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور سُنّت سے ملتا ہے وہ بیعت پر مبنی ہے۔ چنانچہ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب صحابہ رضی اللہ عنہم خندق کھود رہے تھے تو ان کی زبانوں پر یہ شعر جاری تھا:

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا   عَلَى الْجِهَادِ مَابَقِينَا اَبَدًا [(۱)]

اسلامی تاریخ میں بیعت کا مقام

میں عرض کر چکا ہوں کہ اُمتِ مسلمہ کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں جماعت سازی کے لیے صرف بیعت ہی کی اساس ملتی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد جو نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوا اس کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ پھر جب صحابہؓ نے محسوس کیا کہ خلافت کا ادارہ رفتہ رفتہ ملوکیت میں تبدیل ہو رہا ہے اور انہوں نے اس زوال کو روکنے کے لیے جدوجہد کی تو اس میں بھی بیعت کا طریقہ ہی اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما دونوں کی جدوجہد بیعت کی اساس پر ہوئی۔ اس کے بعد جب ملوکیت نے اپنے پنجے پوری طرح گاڑ لیے تب بھی خلفاء (اصل میں ملوک) اپنی حکومت کو بیعت کی بنیاد پر ہی استوار کرتے رہے۔

اصولی طور تو اسلام میں مذہب و سیاست کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے‘ لیکن عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ ملوکیت میں یہ تقسیم نمایاں ہونے لگی تھی۔ نتیجتاً بیعت کا ادارہ بھی دو

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الجهاد والسير‘ باب التحريض على القتال۔ وصحيح مسلم‘ كتاب الجهاد والسير‘ باب غزوة الاحزاب۔

حصوں میں منقسم ہو گیا۔ بادشاہ عوام سے سیاسی اطاعت کا وعدہ بیعت کے ذریعے لیتے تھے' لیکن ساتھ ہی اسلامی معاشرے میں افراد کے تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کے لیے صوفیائے کرامؒ بھی لوگوں سے روحانی اور اخلاقی اطاعت کا وعدہ لینے لگے' اور یہ شے بیعت ارشاد کہلائی۔

بیعتِ ارشاد سے کیا مراد ہے؟ ایک شخص محسوس کرتا ہے کہ اسے کسی بزرگ رہنما کی ضرورت ہے جو اسے ایک بہتر مسلمان بننے میں مدد دے۔ اس مقصد کے تحت وہ کسی ایسے متقی شخص کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنا چاہتا ہے جو خود اپنے نفس کا تزکیہ کر چکا ہو اور دوسروں کی اس راہ میں رہنمائی کر سکتا ہو۔ یہ وابستگی بیعت کی صورت میں ہوتی ہے۔ یعنی مرید یا سالک کسی بزرگ سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ آپ مجھ سے علم' تجربے اور تقویٰ میں بہت آگے ہیں' لہٰذا آپ میری رہنمائی فرمائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے' میں اس معاملے میں آپ کی اطاعت کروں گا اور آپ میرے اخلاق اور میری روحانی ترقی کی نگرانی فرمائیں گے۔ یہ وہ شے ہے جسے بیعتِ ارشاد کہا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے طویل انحطاط اور زوال کے نتیجے میں آج صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ جب بیعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو عموماً ایک عام مسلمان کے سامنے بیعتِ ارشاد ہی کا تصور آتا ہے۔ یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ بیعتِ ارشاد کے لیے قرآن مجید میں جواز بیعت النساء کی صورت میں موجود ہے' جس کا مقصد بھی یہی تھا جو بیعت ارشاد کا ہوتا ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ گزشتہ صدی میں مسلمانوں کو غیر ملکی استعمار سے نجات دلانے کے لیے جتنی بھی عسکری تحریکیں چلیں' ان سب کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں سید احمد بریلویؒ کی تحریکِ شہیدین' لیبیا میں محمد بن علی السنوسی کی سنوسی تحریک' اور سوڈان میں محمد احمد المہدی کی تحریک' سب میں نظم کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ موجودہ صدی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جب ۱۹۱۳ء اپنی جماعت یعنی حزب اللہ قائم کی' تو بیعت ہی کو اس کی اساس کے طور پر اختیار کیا۔ اسی طرح الاخوان المسلمون کے بانی ارکان نے شیخ حسن البناء شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی' جو مرشدِ عام کہلاتے تھے۔ اس موقع پر میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے موجودہ صدی کا ایک نہایت اہم واقعہ بیان کروں جو اکثریت کے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ جمعیت علمائے ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی صدارت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے کی' اور علماء سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ سب مل کر ابوالکلام آزاد کو اپنا متفقہ قائد تسلیم کر لیں' ان سے بیعت کریں' اور ہندوستان میں آزادی اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے منظم جدوجہد کا آغاز کیا جائے۔ بدقسمتی سے اس تجویز کو علماء میں پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔

موجودہ صدی کی ایک اور تحریک جو بیعت کی بنیاد پر منظم ہوئی تھی وہ قادیانیت کے فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے تھی۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ۵۰۰ علماء اکٹھے ہوئے' جن میں سے اکثریت کا تعلق دیوبندی مکتبِ فکر سے تھا' اور انہوں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو ''امیر شریعت'' مان کر ان سے بیعت کی۔ اگرچہ مولانا بہت نمایاں مذہبی عالم نہ تھے' اس کے باوجود ان سے بیعت کرنے والوں میں مولانا احمد علیؒ لاہوری اور مولانا انور شاہ کاشمیریؒ جیسے جید علماء بھی شامل تھے۔

غرضیکہ اُمت کی تیرہ سو سالہ تاریخ کی گواہی ہمارے سامنے موجود ہے کہ جہاں بھی کسی منظم جدوجہد کے لیے جماعت سازی کی ضرورت پیش آئی وہاں ہمیشہ بیعت ہی کے طریقے کو اختیار کیا گیا۔ خواہ معاملہ حکومت بنانے کا ہو' یا اسلامی اصولوں کو نظامِ حکومت میں دوبارہ رائج کرنے کا ہو' تزکیۂ نفوس اور اصلاحِ باطن کا مسئلہ ہو' یا مسلمانوں کے علاقوں کو غیر مسلموں سے آزاد کرانے کی جدوجہد ہو' ہر بار افراد کو جمع کرنے اور منظم کرنے کے لیے صرف بیعت کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس میں واحد استثناء مولانا مودودیؒ کی جماعت اسلامی کا ہے جو بیعت کی بنیاد پر قائم نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اُمت کی تاریخ کے ۱۳سو برسوں کا حوالہ دیا ہے' کیونکہ چودھویں صدی میں ایک بڑی تحریک کا دستوری بنیاد کو اختیار کرنے کا معاملہ بھی موجود ہے۔

تنظیم اسلامی میں شمولیت کی بیعت

جہاں تک میرا تعلق ہے' تو میں نے تنظیم اسلامی بیعت کی بنیاد پر قائم کی ہے۔

تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے جو بیعت ہے اس کے الفاظ ایک مستند حدیث سے لیے گئے ہیں۔ یعنی بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر یثرب سے آنے والوں نے رسول اللہ ﷺ سے جن الفاظ میں بیعت کی' انہی الفاظ کو ایک تبدیلی کے ساتھ ہم نے اختیار کیا ہے۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ اس حدیث کے الفاظ میں ایک حزب اللہ قائم کرنے کے لیے پورا منہج اور طریقہ کار موجود ہے' یعنی ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کو قائم کرنے کا پورا نقشہ اس حدیث سے مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کوئی جماعت بنا رہے ہیں تا کہ سماجی سطح پر فلاح و بہبود کا کام کیا جا سکے تو کسی بھی قسم کا دستوری ڈھانچہ اختیار کیا جا سکتا ہے' لیکن جہاں معاملہ ہو ایک انقلابی جماعت کے قیام کا' جسے غیر معمولی نظم اور اندرونی ہم آہنگی درکار ہوتی ہے' تو یہ جماعت صرف بیعت کی بنیاد پر قائم ہونی چاہیے۔

پیش نظر حدیث حضرت عبادة بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے' اور امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ دونوں نے اسے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ بیعت کے الفاظ ایسے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے ان کے ذریعے تنازعات کے تمام دروازے بند فرما دیے ہیں۔ عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((بَایَعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ' فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ' وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَهِ' وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا' وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ' وَعَلٰی اَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا' لَا نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ)) (۱)

''ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے' خواہ آسانی ہو یا مشکل' خواہ ہماری طبیعت آمادہ ہو یا ہمیں اس پر جبر کرنا پڑے' اور خواہ دوسروں کو ہمارے اوپر ترجیح دے دی جائے۔ ہم اصحابِ اختیار سے جھگڑیں گے نہیں' لیکن سچ بولیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں گے' اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے پرواہ رہیں گے۔''

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب کیف یبایع الامام الناس 'و کتاب الفتن' باب قول النبی ﷺ سترون بعدی امورًا تنکرونها۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامیر فی غیر معصیة ......

غور کیجیے کہ جہاں بھی کوئی اجتماعی جدوجہد ہو رہی ہو اور کسی خاص مسئلے پر فیصلہ کرنا پڑے تو بے شمار آراء سامنے آتی ہیں اور بہت سے مختلف بلکہ متضاد حل پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن قائد کو صرف ایک ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر جن ارکان کی رائے کے مطابق فیصلہ ہو جائے وہ اس پر عمل کرنے میں انشراح اور آمادگی محسوس کریں گے' اور جن کی مرضی یا رائے کے خلاف فیصلہ ہو جائے وہ عمل درآمد کے معاملے میں انقباض محسوس کریں گے۔ حضور ﷺ نے تنازعات اور نظم کی خلاف ورزی کے اس امکان کو اس طرح ختم کیا کہ صحابہؓ سے یہ عہد لے لیا کہ وہ ہر حال میں اطاعت کریں گے' خواہ جو حکم انہیں ملا ہو وہ اس سے سو فیصد متفق ہوں یا نہ ہوں' خواہ حکم پر عمل کرنے میں وہ دل کی آمادگی پائیں یا انہیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے۔

اسی طرح اصحابِ اختیار کو مقرر کرنے کا معاملہ بھی ایسا ہے جہاں بہت سے اختلافات اُبھر سکتے ہیں۔ اگر کسی باصلاحیت مگر نووارد رُکن کو کسی اہم عہدے پر فائز کر دیا جائے تو پرانے اراکین میں ناراضگی پیدا ہو سکتی ہے۔ تنازع کے اس دروازے کو بند کرنے کے لیے حضور ﷺ نے صحابہؓ سے یہ عہد لیا کہ مختلف عہدے یا ذمہ داری کے مناصب دینے کے معاملے میں کُل اختیار میرا ہوگا' اور یہ کہ وہ لازماً سمع وطاعت کی روش پر قائم رہیں گے' خواہ وہ یہ محسوس کریں کہ دوسروں کو ان پر ترجیح دی جا رہی ہے۔

یہ بات نہایت اہم ہے کہ ''سمع وطاعت'' کی اصطلاح سے غیر معمولی نظم کا جو نقشہ ذہنوں میں اُبھرتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک اسلامی انقلابی جماعت کے ارکان بلا سوچے سمجھے اور اپنے ذہن اور عقل وفہم کی صلاحیتوں کو بالائے طاق رکھ کر امیر کی اطاعت کرتے رہیں گے۔ ان کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ جس بات کو حق سمجھتے ہوں اس کا برملا اظہار کریں' اور امراء کے طرزِ عمل یا حکمت عملی میں کوئی غلط شے دیکھیں تو اپنی زبانوں پر تالے ڈال کر نہ بیٹھے رہیں۔ چنانچہ بیعت کے الفاظ میں ہے کہ **''اَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا''** (ہم سچ کہیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں گے)۔ ظاہر ہے کہ بیعت کی بنیاد پر تنظیم بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آخری فیصلے کا اختیار ایک فرد کے پاس ہوگا' یعنی

تمام بحث وتمحیص اور گفتگو اور مشاورت ہو جانے کے بعد جب فیصلے کا وقت آئے گا تو یہ فیصلہ ووٹوں کی گنتی سے نہیں بلکہ امیر کی مرضی سے ہوگا۔

تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے بیعت کے جو الفاظ اختیار کیے گئے ہیں‘ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں ایک شخص شعوری طور پر یہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ پھر وہ اللہ سے اپنے تمام سابقہ گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور مستقبل میں گناہوں سے اجتناب کا پختہ وعدہ کرتا ہے۔ دوسرے حصے میں وہ اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ ہر اُس شے کو چھوڑ دے گا جو اللہ کو ناپسند ہے‘ اور یہ کہ وہ اس کے راستے میں مقدور بھر جدوجہد کرے گا‘ اپنے مال سے بھی اور جان سے بھی‘ تا کہ اس کے دین کو قائم کیا جا سکے۔ تیسرے حصے میں وہ تنظیم اسلامی کے امیر کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ ان کے تمام احکام کو سنے گا اور ان پر عمل کرے گا‘ بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ یہ آخری شق‘ یعنی اطاعت ''فی المعروف'' ہوگی نہ کہ مطلق‘ وہ اضافہ ہے جو ہم نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کے الفاظ میں کیا ہے۔

بیعت کی تاکیدی اہمیت

حضرت عبداللہ بن عمر ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً)) (۱)

''جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہ تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

یعنی ایسا شخص حقیقی معنوں میں ایک مسلمان کی موت نہیں مرا۔ یہ حدیث بالکل واضح ہے‘ لیکن ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہے کہ اگر ہم کسی متقی شخص کے ساتھ اپنے آپ کو بیعتِ ارشاد کے ذریعے وابستہ کر لیں تو اس حدیث پر عمل ہو جائے گا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے! مذکورہ حدیث میں بیعت سے مراد وہ بیعت ہے جو اُمت کی مجموعی ہیئت سے تعلق رکھتی ہے‘ اور اس کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کم از کم شرائط پوری کرنے والی اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت قائم ہو تو خلیفۃ المسلمین یا امیر المؤمنین

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الامارۃ‘ باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمینعند ظھور المسلمین......

کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مسلمانوں پر ایسی ریاست اور ایسا نظام بالفعل قائم کرنے کے لیے کوشش فرض ہو جاتی ہے‘ اور اس جدّوجہد کے لیے جو حزب اللہ قائم ہوگی‘ اس کے امیر سے بیعت کی جائے گی۔

ظاہر ہے کہ نظامِ خلافت آسانی سے قائم ہو جانے والی شے تو نہیں ہے‘ بلکہ اس کے لیے ہمیں جدوجہد کرنا پڑے گی اور بڑی بڑی قربانیاں دینا پڑیں گی۔ اپنا وقت‘ صلاحیتیں‘ اور وسائل کھپانے پڑیں گے۔ دنیا میں کوئی بھی بڑا کام اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر اسلامی ریاست قائم نہیں ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے قائم کرنے کے لیے کوشش کریں‘ اور یہ کوشش ایک مضبوط اور منظّم جماعت ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے نہ کہ انفرادی طور پر۔ اور ایک مضبوط اور منظّم جماعت صرف بیعت ہی کے اصول کو اختیار کر کے وجود میں لائی جا سکتی ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک ہی ایسی صورت ہے جس میں ایک مسلمان کو بیعت کے بغیر زندگی گزارنے کی اجازت ہے۔ یعنی فتنے اور فساد کی وہ کیفیت جس میں کسی کو کسی کا ہوش نہ ہو‘ کسی کو معلوم نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے‘ ایسے میں کس کا ساتھ دینا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے۔ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ فتنہ وفساد کے عہد میں رہ رہے ہیں‘ اور اس لیے بیعت سے مستثنیٰ ہیں‘ تو جان لیجیے کہ ایسی حالت میں آپ کے لیے جائز نہیں کہ کسی مہذب معاشرے میں رہیں‘ بلکہ ضروری ہے کہ آپ ہر شے کو چھوڑ کر کسی جنگل میں جا بسیں۔ لیکن اگر آپ ایک نارمل زندگی گزار رہے ہیں‘ شہری زندگی اور ٹیکنالوجی کے تمام فوائد اور سہولتوں سے مستفید ہو رہے ہیں اور پھر بھی آپ کا خیال ہے کہ فتنہ وفساد کی وجہ سے آپ کو بیعت سے استثناء مل گیا ہے تو یہ خیال محض خود فریبی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہمت دے کہ ہم حق کو اختیار کریں خواہ وہ کسی جگہ سے ملے‘ اور ہمیں توفیق دے کہ ہم مسلمان جئیں اور مسلمان مریں۔ اور توفیق دے کہ ہم وہ کام کریں جو اسے پسند ہوں۔ آمین OO

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحکمت** کی

وسیع پیمانے ......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ۔ اور۔ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہوسکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**